ڈاکٹر قیصر آفتاب احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ
ماریہ بلال
لیکچرر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ
محمد عثمان ارشد،
ایم فل اسکالر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ

محمد حمید شاہد اور احمد جاوید کے افسانوں میں عہدِ جدید کی ثقافت کا تقابلی جائزہ

ABSTRACT

A comparative analysis of modern culture in the fictions of Muhammad Hameed Shahid and Ahmed Javed
By Dr. Qaiser Aftab Ahmed, Assistant Professor, Department of Urdu, University of Sialkot.
Maria Bilal, Lecturer, Department of Urdu, University of Sialkot.
Muhammad Usman Arshad, M.Phil. Scholar, Department of Urdu, University of Sialkot.

Fiction means a short, fictitious story or narrative in which an important aspect or event of life is presented. The identity of a nation or country is called its civilization or culture, which separates it from other nations. The main purpose of a nation's civilization is to define the boundaries of that nation. Various poets and writers have resorted to their works for the promotion of culture. Muhammad Hameed Shahid was born on 23 March 1957 in Pindi Gheb District Attock. His literary taste was nurtured by the home environment. He took up the pen in fiction writing along with criticism, novel writing and column writing. Ahmad Javed was born on April 22, 1948 in Campbell pur district of Attock. His affinity towards literary taste was due to his MA in Urdu and his affiliation with the teaching department. His words, his stories and his mood show pure literary seriousness.In the fictions of Muhammad Hameed Shahid and Ahmad Javed, all aspects of religious and social culture are described which characterize all aspects of rural and urban life. They have made a unique effort to highlight all aspects of culture through his fiction and highlighted the civilization of their society by including many cultural colors in their legends.

Keywords: Fiction, civilization, culture, aspects of religious, criticism, legends.

اُردو میں افسانے کی صنف مغربی ادب کی دین ہے۔ یہ صنف بیسویں صدی کی ابتدا سے ہمارے ہاں آئی۔ صنف افسانہ بہت ہی قلیل عرصے میں دوسری اصناف میں اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی۔ افسانے کی تعریف اور معنی مختلف زبانوں میں مختلف رہے ہیں۔ لفظ افسانہ فارسی زبان سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی جھوٹی کہانی، قصہ اور داستان کے ہیں۔ لغوی معنوں کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے کے متبادل ہیں۔ قصہ، کہانی، حکایت، روایت اور افسانہ وغیرہ بظاہر تو بلحاظ معنی ایک جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مفہوم میں فرق ہے۔ اُردو ادب میں افسانہ سے مراد ایک ایسی کہانی یا واقعہ ہے جس کا مرکزی خیال یا تعلق انسانی زندگی سے جڑا ہو۔ افسانہ دراصل زندگی کی حقیقت کو لفظوں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ حقیقت کے منافی بھی نہ لگے اور حقیقت کے برعکس بھی نہ ہو۔ افسانہ نگاری دراصل کم الفاظ میں کسی بھی بات کو بیان کرنے کا نام ہے۔ افسانہ، بیانیہ انداز میں ایسی تحریر ہے جس میں زندگی کے تعلق سے کسی حادثہ یا تجربہ کو مختصراً اس انداز میں بیان کیا جائے کہ قاری اسے بھرپور دلچسپی سے پڑھ سکے۔ غلام عباس فن افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> افسانہ نگاری ادب کی سب سے آسان صنف ہے، ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی صرف تھوڑی سی کوشش سے افسانہ لکھتا ہے۔ بشرط کہ وہ جانتا ہو کہ زندگی کی حقیقت کو کم سے کم لفظوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نثر کی تمام اصناف میں اسی لیے برتری رکھتا ہے کہ وہ چند صفحات میں لکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پیش کر سکتا ہے۔(۱)

یہ بات حقیقت ہے کہ اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز منشی پریم چند سے پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پریم چند نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کا آغاز کیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے پریم چند کی پیروی کی اور اس کے ہم عصر افسانہ نگار کہلائے۔ اردو افسانے کو ترقی پسند کہلوانے کے لیے ایک صدی سے زائد کا عرصہ لگا۔ جب یہ فکری و فنی سطح پر ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر کر نئے عہد میں داخل ہوا تو ترقی پسند افسانہ کہلایا۔ یہ اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابتدا ہی میں بہت اچھے فن کار مل گئے جنھوں نے اسے بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اردو افسانہ تراجم کی صورت میں اور بعد میں طبع زاد تخلیقات کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ افسانہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ سائنسی انقلاب کا آغاز سولھویں صدی میں ہوا۔ یہ انقلاب انگلینڈ سے شروع ہوا اور یورپ تک پھیلنے کے بعد اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فرصت کے لمحات کم ہونے لگے تو لوگوں کے پاس داستان سننے کا وقت کم پڑ گیا۔

یہی وہ حالات تھے جو افسانے کے نشوونما کا باعث بنے اور اس سے لوگ کم وقت میں اپنی ادبی پیاس بجھا سکیں۔ اُردو ادب میں فن افسانہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ یہ دور تیزی سے بدلتے

ہوئے حالات اور ایجادات واختراعات کا زمانہ تھا۔اس دور میں لوگ زیادہ تر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوئے اور مافوق الفطرت کہانیوں کی بجائے حقیقت کی دنیا کے دکھ سکھ، مصائب و آلام کا ذکر ادیبوں کے فن پاروں میں نظر آنے لگا۔قدیم افسانے میں پلاٹ عموماً مافوق الفطرت عناصر کی مدد سے ترتیب دیا جاتا تھا۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

> سائنس کے اس برق رفتار عہد میں انسان کی سب سے بڑی دولت زندگی کے تیزی سے دوڑتے ہوئے لمحات ہیں اس تیزی سے دوڑتے ہوئے لمحات کی قیمت مقابلے، اور مسابقے، نے بڑھا دی ہے۔۔۔مختصر افسانے نے انسان کو مجبوریوں اور پابندیوں میں اسے وہی چیز دی ہے جس کی اسے ضرورت تھی اور ایسے انداز میں دی جو زمانے کی نزاکتوں اور لطافتوں سے مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے۔(۲)

افسانوی ادب میں جن پریوں کی کہانیاں اور کرداراس وقت رائج رہے جب تک لوگوں کے پاس فرصت کے لمحات تھے۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات یکسر بدل گئے۔مسلمان حاکم سے محکوم ہوگئے۔ اس انقلاب نے زندگی کے تمام شعبہ جات کو متاثر کیا۔ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا معاشی اور سماجی ڈھانچہ تباہ ہوکر رہ گیا تھا۔ ثقافت، تہذیب اور کلچر کو ایک ہی معنی میں لیا جاتا ہے۔تہذیب سے مراد طریقہ کار یا انداز ہے۔کسی معاشرے میں انسانوں کے رہنے کا طریقہ کار یا زندگی گزارنے کے ضوابط سے مراد ثقافت ہے۔کسی معاشرے،قوم یا گروہ کا رکھ رکھاؤ اور انداز زندگی ثقافت کے زمرے میں آتا ہے۔کسی بھی تہذیب یا کلچر کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک باطنی اور دوسرا ظاہری۔ باطنی پہلو میں تصوراتِ زندگی، اصول وضوابط یا زندگی گزارنے کا سلیقہ شامل ہیں اور ظاہری پہلو میں لباس، زبان، رہن سہن اور تمام طرز کے رسوم و رواج شامل ہیں جن سے کسی مخصوص علاقے یا قوم کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہ کسی مخصوص معاشرتی گروہ سے تعلق کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ظاہری پہلو کی نشاندہی آسان اور شعور کے مطابق ہوتی ہے مگر اس کے برعکس باطنی پہلو کو جاننے کے لیے گہرے غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ثقافت یا تہذیب سے مراد ایسے نظریات یا اصول زندگی ہیں جن کی بنیاد پر کوئی معاشرہ ایک نظام کے زیرِ اثر زندگی گزارے اور ان سے اس معاشرے کا نصب العین منسلک ہو اور ان نظریات کی بنیاد سے اقوام میں فرق کیا جاسکے۔کسی ایک قوم کی تہذیب اس کو دوسری اقوام سے الگ رکھتی ہیں اور ہر قوم یا معاشرہ دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے۔ثقافت اصل میں کسی قوم کی پہچان ہوتی ہے:

> تہذیب کسی ایک سلسلہ کی روایتوں پر مبنی انسانی سماج کی ایک خاص درجہ تک ترقی کا نام ہوگا۔اس ترقی میں مسائل،صنعت وحرفت، معاشرتی وسماجی زندگی، مذہب اور علوم وفنون کے علاوہ سب سے بڑھ کر شہری زندگی کا قیام اور اس کی مرکزی حیثیت شامل

ہیں۔اس طرح تہذیب کی اصطلاح سماج کے سبھی پہلوؤں اور محیط اور اس کی زندگی
کے تمام متعلقات پر حاوی ہوگی۔(۳)

معاشرتی اقدار اور رویے بھی تہذیب کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرز کی تہذیب وتمدن میں انسانی رویے قابل ذکر ہوتے ہیں۔کسی معاشرہ یا گروہ کا رہن سہن اور لباس اس کو دوسری اقوام سے الگ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات چیت کا انداز، زبان اور لین دین کا طریقہ کار اس گروہ کی شناخت ہوتا ہے۔کسی قوم کے رسم ورواج اور آپس کے تعلقات اس قوم کی تہذیب کی اہم علامت ہوتے ہیں اور ان رسم ورواج کی بنیاد پر ان اقوام کی پہچان میں آسانی ہوتی ہے۔کسی قوم کی ثقافت دوسری قوم سے فرق اور مماثلت کی وجہ بھی ہوسکتا ہے۔

ثقافت یا تہذیب کے ہر عنصر کو ظاہری اور باطنی پہلو سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی ثقافت کسی قوم کی سب سے بڑی پہچان ہے جو اسے دوسری اقوام سے الگ اور منفرد رکھتی ہے۔ مذہبی ثقافت، تہذیب کا تعلق زمانہ قدیم سے ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مذہبی ثقافت کا تعلق کسی مذہب کی ابتدا سے ہوتا ہے اور اس میں سب سے اہم چیز ایک مذہبی گروہ کا ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے لحاظ سے دوسرے مذہبی گروہ سے نمایاں فرق کی نشاندہی ہے۔ مذہب اسلام میں ارکان اسلام اسلامی تہذیب کی شناخت ہیں۔ اسی طرح مسلم اور غیر مسلم تہذیب میں عبادات کا تصور ان اقوام کی شناخت کا سبب ہے۔ اسلامی معاشرے میں ارکان اسلام اور عبادات کے ساتھ ساتھ لباس، خوراک اور طرزِ زندگی بھی اسلامی تہذیب کو غیر اسلامی معاشرے سے الگ کرتی ہے۔ اسلامی ثقافت میں نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ اسلامی اقدار کی علامات ہیں اور اسی طرح مسجد، مندر اور گرجا وغیرہ مختلف مذاہب کی ثقافت کو بیان کرتے ہیں۔کسی قوم کی تہذیب کا اصل مقصد اُس قوم کی حدود مقرر کرنا ہے اور اُس کو جغرافیائی لحاظ سے کسی دوسرے گروہ سے الگ شناخت دینا ہیں۔کوئی قوم یا گروہ جہاں بھی اپنی ثقافت کی حدود مقرر کرتا ہے وہ اس قوم کا وطن یا ارض کہلایا جائے گا۔اس ضمن میں فیض احمد فیض بیان کرتے ہیں:

کسی قوم کے کلچر کے عرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم اپنی جغرافیائی حدود کہاں مقرر
کرتی ہے۔وہ جہاں بھی اپنے وطن کی حدود مقرر کرتی ہے یا اپنے کلچر کی زمینی حد ارضی
حد مقرر کرتی ہے اس کو کلچر کا عرض کہہ لیجیے۔(۴)

درج بالا منظر نامے کے تحت شعرا اور ادبا نے ثقافت کے فروغ کے لیے اپنی تخلیقات کا سہارا لیا اور معاشرے کے بیشتر ثقافتی پہلوؤں کو اپنی تخلیقات میں شامل کیا۔ ان ادباء میں محمد حمید شاہد اور احمد جاوید بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنی قوم کے ثقافتی رنگوں کو شامل کر کے اپنے معاشرے کی تہذیب کو اجاگر کرنے میں نمایاں کام کیا۔

محمد حمید شاہد ۲۳ مارچ ۱۹۵۷ میں پنڈی گھیب ضلع اٹک پنجاب پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین نے ان کا نام محمد حمید رکھا، بعد میں شاہد کا اضافہ انھوں نے خود کرلیا۔محمد حمید شاہد کی مطالعے کی طرف رغبت کی وجہ ان کے والد کا

اپنے گھر میں بنایا گیا کتب خانہ تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی۔ بعد ازاں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں داخلہ لیا۔ محمد حمید شاہد کی پہلی تخلیق سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر ایک کتاب ''پیکرِ جمیل'' کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں انھوں نے انشائیے بھی لکھے مگر جلد ہی افسانہ نگاری کی طرف آ گئے۔ انھوں نے اپنا پہلا مضمون میٹرک میں لکھا جو ''نوائے وقت'' راولپنڈی کے میگزین میں چھپا۔ ان کا پہلا ادبی کالم ''برسبیلِ تذکرہ'' کے عنوان سے ''چٹان'' لاہور میں شائع ہوا اور پہلا افسانہ ''ماسٹر پیس'' رسالہ ''سیارہ'' میں شائع ہوا۔ محمد حمید شاہد کے افسانوی مجموعے ''بند آنکھوں سے پرے''، ''جنم جہنم'' اور ''مرگ زار'' کی اشاعت کے بعد ان کا شمار اسی کی دہائی کے نمایاں ترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ انھوں نے افسانہ نگاری، تنقید نگاری اور ناول نگاری کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کے لیے بھی قلم اٹھایا۔ ان کو ''پیکرِ جمیل'' تحریر کرنے پر ۱۹۹۵ء میں سیرت نگاری کا ایوارڈ ملا۔ ادب بورڈ نے ۱۹۹۷ء میں لیاقت میموریل ہال راولپنڈی میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے منعقدہ تقریب میں این۔سی۔سی گولڈن جوبلی ایوارڈ دیا گیا۔ مرکز اخبار کی طرف سے ۱۹۹۸ء میں کالم نگاری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے زوار طالب رقم طراز ہیں:

> قصہ گوئی، داستان سرائی، ناول، کہانی اور اب افسانہ ممکن ہے مستقبل کا انسان کسی اور نام سے کہانی سنائے لیکن بنیادی طور پر فن وہی ہے جو ابتدائے آفرینش سے اب تک پورے تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ محمد حمید شاہد کا تعلق بھی اسی فن سے ہے اور جدید دور کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ حمید شاہد کی تصانیف میں ایک تخلیقی جمال اور واضح سوچ نظر آتی ہے۔ حمید شاہد ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔۔۔ وہ ایسے تخلیق کار ہیں جو زندگی کی شاہراہوں سے زیادہ اس کی پگڈنڈیوں پر سے گزرے ہیں۔(۵)

احمد جاوید ۲۲ اپریل ۱۹۴۸ء کو با مقام کیمبل پور ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کیمبل پور سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو کیا ہے اور ایک عرصہ تک شعبہ تدریس سے منسلک رہے۔ اردو میں ایم اے اور شعبہ تدریس سے تعلق کی بنا پر ان میں ادبی ذوق پروان چڑھا۔ گھریلو جھگڑے، تشدد، عورت کا عورت پر ظلم اور حقوق نسواں کا احاطہ قلم میں آئے ہیں۔ انھوں نے نفسیات پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے ہاں دیہاتی طرز معاشرت، تہذیب و ثقافت، معاملات و مسائل کی پیش کش میں گہری بصیرت اور مشاہدے کا ثبوت ملتا ہے۔ نام نہاد اقدار، رسوم و رواج، جاگیردارانہ نظام، نسل در نسل عالمی جہالت اور ذات برداری کا نظام موضوع بنتا ہے۔ احمد جاوید نے ۱۹۶۸ میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ پہلا علامتی افسانہ ''سردار کی محبت'' دسمبر ۱۹۷۲ میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''غیر علامتی کہانی'' ۱۹۸۳ میں شائع ہوا اور بعد ازاں ''چڑیا گھر''، ''گم شدہ شہر کی داستان'' اور ''رات کی رانی'' بالترتیب مختلف ادوار میں شائع ہوئے۔ وہ ایک سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کی باتوں، ان کی

کہانیوں اور ان کے مزاج سے خالص ادبی سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے میں ہر مزاج اور موضوع کی کہانیاں ہیں، اسی طرح اُن کے افسانوں کے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''غیر علامتی کہانی'' میں آمریت کے بدترین دور کا اثر نمایاں ہے جس میں حبس، گھٹن، خوف اور مایوسی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک افسانوی مجموعے ''رات کی رانی'' میں عورتوں کے مسائل بیان کیے ہیں اور معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے تمام افسانوی مجموعے اسلوب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حامد بیگ ان کے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> احمد جاوید نے بے معنی افسانہ لکھنے کے حوالے سے مضحکہ خیز صورت حال کا تمسخر اس طرح اُڑایا ہے کہ وہ اپنے علامتی افسانوں کو علامتی نہیں کہتا۔ اس نے تو ترقی پسند فارمولے کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ لفظوں کے الٹ پھیر کو افسانہ نہیں مانا، تشبیہوں کے مقابلے میں استعارے اور علامت کو چنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے نزدیک زمینی بو باس کی بھی اہمیت ہے اور روایت کے شعور کی بھی۔(۶)

سماج میں رہتے ہوئے ہر قسم کے انسان اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوئے ہیں۔ جاہل اور عقل مند، شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد عورت، مالک اور نوکر، فرد اور فرقہ، حاکم اور محکوم، امیر ملک اور غریب ملک دونوں ہی کے باشندے غرض ہر طرح کے لوگوں کو اس کمزوری کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ افراد کی تنگ دلی اور خود غرضی ان کو پستی کی طرف دھکیلتی ہے۔ حد سے بڑھا ہوا لالچ دل و دماغ کو بے قابو کر دیتا ہے۔ محمد حمید شاہد کے پہلے افسانوی مجموعے ''بند آنکھوں سے پرے'' کا پہلا افسانہ ''برف کا گھونسلہ'' میں انھوں نے دو ماؤں کی ممتا کا موازنہ کیا ہے۔ جس میں معاشرتی اور مذہبی ثقافت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار محسن کی بیوی سردی سے پہلے سردی سے بچاؤ کے مکمل انتظامات کرنا چاہتی ہے جبکہ دوسری طرف محسن ایک چڑیا کو دانہ ڈالتا ہے اس کے خیال کے مطابق اس کی نماز فجر کی ادائیگی میں اس چڑیا کی چہچہاہٹ شامل ہے۔ کیوں کہ اس کو صبح سویرے بیدار کرنے میں چڑیا کی آواز ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دوسری طرف محسن کی بیوی اپنے بچوں کے لیے سردی سے بچاؤ کے انتظامات میں مصروف عمل ہے تاکہ یہ یخ سردی شروع ہونے سے پہلے مکمل انتظامات کیے جا سکیں۔ جس کے لیے وہ گرما گرم ملبوسات کے ساتھ ساتھ راشن، خشک میوہ جات اور آگ جلانے کے لیے لکڑیوں کا بندوبست کر لینا چاہتی ہے۔ افسانے نگار نے اس کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

> لکڑیوں کا بندوبست کرو جی..... خشک لکڑیاں نہ ہوں گی تو ان ننھی جانوں کو سردی سے کیسے بچاؤ گے؟..... دیکھو ساتھ والوں نے لوہے کی انگیٹھی بنوائی ہے، بارہ سو میں۔ اس کے اوپر پائپ لگوا کر روشن دان سے ایک سرا باہر نکال دیا ہے کہ دھواں کمرے

میں نہ بھر جائے۔ میرے مانو تو ویسی ہی بنوالو کہ برفیلی راتوں میں لکڑیاں نہیں
جلائیں گے تو کمرا گرم نہیں ہوگا۔(۷)

محسن کی بیوی کمرے کے روشن دان کو سردی سے بچنے کے لیے بند کر دیتی ہے تا کہ ٹھنڈی ہوا کمرے میں گزر نہ ہو سکے۔ جبکہ اسی روشن دان میں چڑیا کا گھونسلہ بھی موجود تھا۔ ایک طرف ماں بچوں کو سردی سے بچاؤ کے لیے روشن دان بند کرتی ہے تو دوسری طرف چڑیا روشن دان بند ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کے پاس نہیں جا سکتی اور وہ سردی کی وجہ سے مر جاتی ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے زوار طالب چوہدری لکھتے ہیں:

چڑیا کے اس گھر میں آنے کا راستہ روشن دان کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہوتا ہے، جو سردی سے
بچاؤ کی خاطر لگوا دیا جاتا ہے۔ جس کے سبب چڑیا اور اس کے بچے برف میں دب کر
مر جاتے ہیں۔ کہانی کے مرکزی کردار پر اس بات کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ مری چھوڑ دینے
کا فیصلہ کرتا ہے۔ کہانی کا یہ انجام قاری پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے اور مظلوم چڑیا کے
المناک انجام پر اداس کر دیتا ہے چڑیا جو بظاہر ایک کمزور اور بے بس پرندہ ہے لیکن
مامتا کا جذبہ انسان اور چڑیا دونوں میں ایک سا ہے۔(۸)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے دو معاشرتی رویوں کو بیان کیا ہے جس میں ماؤں کی ممتا اور نماز کی ادائیگی بھی شامل ہے۔ اس طرح اس افسانے میں معاشرتی اور مذہبی ثقافت کا اظہار ملتا ہے۔

احمد جاوید کے افسانوی مجموعے ''چڑیا گھر'' میں شامل افسانے ''چوہے'' میں دو ثقافتوں کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں آزادی اور غلامی کی زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں دو چوہوں کی زندگیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو آزادی اور غلامی کی دو مختلف ثقافتوں کو بیان کر رہی ہے۔ افسانہ نگار نے بڑے احسن انداز میں آزادی کی زندگی کو مکمل لطف اندوز، بے خیالی اور بے خوف زندگی کو بیان کیا ہے۔ آزادی میں ہر جاندار بلا خوف اپنی زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو خوشی کے ساتھ گزارتا ہے۔ یہ ثقافت مغلوں کی حکومت کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے، جس میں مسلمان اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے بغیر کسی ڈر کے زندگی گزار رہے تھے۔ ہر قسم کی مکمل آزادی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس افسانہ نگار کے پنجرے والے چوہے کی ترجمانی انگریزوں کی غلامی کو ظاہر کرتی ہے، جس میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے تھے۔ انگریزوں نے اپنے ہر ظلم کا تجربہ مسلمانوں پر کیا تھا۔ یہ غلامی کی زندگی معاشرتی ثقافت کی مکمل ترجمانی کرتی ہے جس میں انگریزوں نے ہندوؤں پر عیاشی کے دروازے کھول دیے مگر وہ بھی غلامی کی زنجیروں میں قید تھے کیوں کہ وہ پنجرے میں چوہے کی طرح ان کی تجربہ گاہ میں استعمال ہونے والے چوہے ہی تھے۔ افسانہ نگار نے معاشرتی ثقافت کی ایسی ترجمانی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

معاشرتی ثقافت میں آزادی اور غلامی کو بڑی اہمیت حاصل ہے انسان کو آزادی کی جبری زندگی کو منتخب کر لینا چاہیے نہ کہ آسائشوں سے مزین غلامی والی زندگی۔ اس افسانے میں بھی احمد جاوید نے دو چوہوں کے درمیان موازنہ کیا ہے جس میں ایک چوہا مکمل آزادی کے ساتھ اپنے بل میں زندگی گزارتا ہے جبکہ دوسرا چوہا ایک سائنسدان کی لیبارٹری میں پنجرے میں قید ہے۔ یہ ثقافت کے دو پہلو ہیں جو مختلف رسم و رواج کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانہ نگار اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> بل سے نکلنے والے چوہوں کے لیے کمرے کی زمین ایک دور تک پھیلی ہوئی وسیع کائنات تھی۔ مگر خطروں سے بھری ہوئی۔ بلی کی خشمگیں نگاہیں ہی ایک عتاب نہیں ہو تا اور بھی کئی ان دیکھے اندیشے ہیں جو چوہوں کو اپنے سوراخوں سے زیادہ دور نہیں جانے دیتے مگر کیا کیجیے کہ پنیر کی خوشبو بھی ایسی ظالم تھی کہ وہ بھی تو کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ کشش کرتی تھی بلاتی تھی۔ ایسی خوشبو کہ جس کے آگے ایک مرتبہ تو خود زندگی بھی بے معنی تھی۔ بے کیفیت تھی۔ (۹)

افسانہ نگار نے آزادی کی زندگی کو پر خطر زندگی سے تشبیہ دی ہے۔ افسانہ نگار نے چوہوں کے توسط سے اس زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے مسلم اور غیر مسلم سلطنتوں اور ثقافتوں سے متاثر ہو کر ان کو بذریعہ حشرات الارض مسلم معاشرے کو مسلم ثقافت کی یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔

محمد حمید شاہد کے اسی افسانوی مجموعے کے افسانے ''اللہ خیر کرے'' میں معاشرتی اور خیالاتی ثقافت کا عنصر پایا جاتا ہے جو نفسیاتی کشمکش کی ایک جنگ ہے۔ اس افسانے میں خیالی دنیا کی عکاسی کی گئی ہے جس میں انسان اپنے محبوب کے لیے خیالی اور مثالی محبت کا خواہشمند ہے۔ افسانے کے کردار کے خیالات میں ''زیبو'' نامی لڑکی کی محبت حاوی ہے جس کے لیے وہ اپنی بیوی لبنیٰ کی محبت کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ جبکہ لبنیٰ اس سے لازوال محبت کرتی ہے۔ جب محسن اپنی خیالاتی محبوب ''زیبو'' کو ہسپتال میں دیکھتا ہے تو اس منظر کو افسانہ نگار یوں بیان کرتے ہیں:

> ''جب گھر کی دِیواریں تک سانجھی ہوں تو دِن میں سامنا ہونے کے بیسیوں مواقع نکل آتے ہیں۔ محسن نے جب بھی اُسے دِیکھا' نظر جما کر نہ دیکھ سکا۔ ہر دفعہ مرعوب ہوا۔ اس کے بدن سے اٹھتی مہک نے اسے بے قابو کیا۔ من میں ایک خواہش پیدا ہوتی ' کاش وہ اُسے چھو سکے' اس کی تنی ہوئی چکنی جلد کے اندر ٹھاٹھیں مارتے رَس کو محسوس کر سکے۔ اسے لگتا اس نے زیبو کو چھو لیا تو اس کی پوروں میں اس کے بدن کا رنگ رس اُتر آئے گا۔'' (۱۰)

یہ افسانہ معاشرتی اور خیالاتی ثقافت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں معاشرتی ثقافت کو

خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انسان اپنی خواہش میں ہمیشہ اپنے معاشرتی رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک ثقافت دوسری ثقافت کو متاثر کرتی ہوئی نظر انداز بھی کرتی ہے اور اس میں جذب بھی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے ''اللہ خیر کرے'' کے موضوع سے خیالاتی اور معاشرتی ثقافتوں کی جو عکاسی کی گئی ہے وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے زوار طالب چوہدری لکھتے ہیں: ''اللہ خیر کرے'' کا عنوان دعائیہ کلمات ہیں یعنی خدا بھلا کرے۔ کہانی محبت کے جذبوں پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ محبت سے متعلق نفسیات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یعنی بظاہر محبت کی تکون کی کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ انسانی کمینگی اور خباثت کی نفسیاتی کہانی ہے، جو آدمی کے کہیں بہت اندر دور چھپی ہوئی ہوتی ہے جس کا وہ خود بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی دعا کے مقدس لفظوں سے اپنے اندر کی عریانی کو ڈھانپنا چاہتا ہے۔ اس محبت کی تکون میں تین کردار محسن، لبنیٰ اور زیبو کے ہیں۔ مرکزی کردار محسن کا ہے۔ جسے ممکن حد تک مصنف نے نفسیاتی روایت کے مطابق پیش کیا ہے۔ (۱۱)

نفسیاتی روایت کو خیالاتی ثقافت کا نام دیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس ثقافت کا انسان کی زندگی میں اہم کردار ہوتا ہے، اس کے بغیر کسی بھی ثقافت کا وجود ممکن نہیں ہے۔ محمد حمید شاہد کے افسانوں میں جنریشن گیپ کو سامنے رکھتے ہوئے دیہی اور شہری ثقافت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بے شک یہ اپنی مٹی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے جنریشن گیپ کے ذریعے مختلف ثقافتوں کے تضادات کو بیان کیا ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کرداروں والد اور بیٹے کے ذریعے دو مختلف ثقافتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف والد مٹی اور مویشیوں سے محبت کرنے والا کردار ہے تو دوسری طرف اس کے برعکس بیٹا شہری زندگی میں ترقی کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ بلندی کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے، اس کو دیہی ثقافت سے نفرت ہونے لگی ہے، اس لیے وہ شہری ثقافت میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے قلم کے ذریعے مٹی کی محبت کو ترجیح دی ہے اور شہری زندگی کو عارضی اور بے سکونی والی زندگی قرار دیا ہے۔ یہ افسانہ دو مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک موازنہ اور تقابلی جائزہ پیش کرنے کی ایک بہترین کوشش ہے۔ اس افسانے کے بارے زوار طالب چوہدری کچھ یوں لکھتے ہیں:

جنریشن گیپ بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ جو کہ آجکل کا ایک اہم مسئلہ بھی ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کی عکاسی کرتا ہے۔ پرانی نسل

جو اپنی مٹی، دھرتی اور اپنی تہذیب سے پیوست ہے اور نئی نسل جو بظاہر ترقی کرنا اور آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ مگر یہ ترقی اسے اپنی تہذیب سے دور کر دیتی ہے۔ افسانے میں زمیندار گھرانے کو دکھایا گیا ہے جو زمین کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں اور مویشیوں سے بھی اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں لیکن ان کا اکلوتا بیٹا زمین سے تعلق توڑ کر بلندی میں پرواز کرنا چاہتا ہے اور بلندی میں یہ خرابی ہے کہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے۔ زمین کی چیزیں اتنی حقیر اور چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ (۱۲)

احمد جاوید کے افسانوی مجموعے ''چڑیا گھر'' کے ایک افسانے ''بھیڑ بکری'' میں چرواہے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں وہ اپنی بھیڑ بکریوں کی حد تک محدود ہے۔ اس کے ساتھ اس کے کتے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس کو مصنف نے چرواہے کی زندگی میں معمولی اہمیت دی ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے دیہی اور دیسی ثقافت کا نقشہ کھینچا ہے جس میں وہ مکمل محو ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ احمد جاوید کے اس افسانوی مجموعے میں زیادہ تر دیہی ثقافت کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کو دیہی ثقافت سے خصوصی لگاؤ ہے اور وہ اس سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہی ثقافت کو مختلف پہلوؤں کو احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر ثقافتی منظر دوسرے منظر سے جدا اور منفرد ہے۔ ''بھیڑ بکری'' افسانے میں بھیڑ بکریوں اور کتے کے رہن سہن، پرورش اور ماحول کو دلکش انداز میں قارئین کے سامنے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ثقافت اب بھی غیر ترقی یافتہ علاقوں میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ثقافت ہمارے معاشرے کا وہ دلکش اور منفرد پہلو ہے جس پر کئی دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنے خیالات و افکار پیش کیے ہیں۔ کہانی میں دیہی ثقافت کے پس منظر میں افسانہ نگار نے بہت اہم سبق دیا ہے کہ بھیڑ بکریوں کو چرواہے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ کتا، کتا ہی ہوتا ہے ایک دو دن تک وہ بھیڑ بکریوں میں حکمرانی کر کے نظام چلا سکتا ہے مگر مسلسل اور مستقل حکمرانی تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے۔ افسانہ نگار کے مطابق کسی بھی ثقافتی ماحول کو کامیاب کرنے کے لیے سردار اور حکمران کی ضرورت ہوتی ہے۔ نااہل اور نالائق حکمران ثقافت اور معاشرے کی تباہی و بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ دیہی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے انھوں نے معاشرتی ثقافت میں حکمران اور سرداروں کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ افسانے کے آغاز میں افسانہ نگار بیان کرتے ہیں:

یہ ایک ایسے کتے کی کہانی ہے جو بھیڑ بکریوں پر حکمرانی کرتا تھا مگر ناگہانی ان کی بھگدڑ کا شکار ہوا اور ان کے قدموں تلے آ کر کچلا گیا۔ آغاز میں اس کے سپرد کوئی کام نہیں تھا۔ چرواہے کے ساتھ اس کی موجودگی ہی بذات خود ایک کام تھا۔ اصل ذمہ داری چرواہے کی تھی جو پشت در پشت، نسل در نسل بھیڑ بکری چراتا آیا تھا۔ چرواہے نے کتے کو اپنے پیشے کے حوالے سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی حالانکہ اس کی موجودگی

سے بھیڑ بکریوں میں ایک انجانا سا خوف جاگزیں رہتا تھا اور اس طرح وہ ایک تعظیم
میں رہتی تھیں مگر چرواہا اسے ایک حد میں رکھتا ہے۔(۱۳)

احمد جاوید کے افسانوی مجموعے ''گمشدہ شہر کی داستانیں'' میں افسانہ ''گدھ'' کے ذریعے شہر کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شوو غل اور ہنگاموں کے اندر آدمی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ بالکونیوں پر کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ کوئی سبزی خرید رہا ہے۔ بچے گیند کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہر طرف رونق اور چہل پہل کا گمان ہے۔ کہیں پہ باغ باغیچے نظر آتے ہیں، موٹریں، بسیں، ٹریفک کا شور، روشنیاں، کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں زندگی کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ شہری زندگی میں ہر کوئی حرکت میں ہے، ہر کوئی اپنے کام میں مصروف ہے۔

اس افسانے میں ایک ایسے آدمی کی داستان کو بیان کیا گیا ہے جو شہر کی مصروفیت میں ''آدمی'' کو تلاش کرتا ہے۔ وہ ہر جگہ گھومتا ہے پر اسے آدمی کہیں نظر نہیں آتے۔ زندگی کی مصروفیت میں ہر کوئی گم ہو گیا ہے۔ کسی کے پاس بھی کسی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس دوران ایک کتا اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ وہ شخص بھاگتا ہے اور کتا اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ بھاگتے بھاگتے وہ ہانپ جاتا ہے اور دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ اس کو آسمان پر گدھوں کا غول نظر آتا ہے۔ ان گدھوں کے شور سے مکان کی چھتوں پر بیٹھے کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ گدھ گھروں کی منڈیروں پر لہراتے ہیں۔ آدمی خیال کرتا ہے کہ گھروں کے اندر انسان زندہ ہی ہیں یا مر گئے۔

مکانوں کے اندر کا تعفن اور سڑانڈ گلیوں میں آتا ہے۔ ادھر ادھر لوٹیں کھاتا ہے۔ میں
چرت سے سب کچھ دیکھتا ہوں اور ناک پر ہاتھ رکھ کے آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ مگر
وہی ایک ہی خیال آتا ہے کہ آدمی زندہ ہے یا مردہ؟(۱۴)

وہ شخص گاؤں سے باہر کھیتوں میں بھاگ جاتا ہے۔ وہاں چمگادڑوں کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں۔ گدھ اپنے کھانے کی تلاش میں بیمار مویشیوں کے پاس بیٹھے ہیں۔ اس افسانے کے اندر بھی احمد جاوید نے مختلف جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ کہیں چوہوں اور بلیوں کا اور کہیں گدھ اور چمگادڑوں کا، ان علامتوں کے استعمال سے وہ انسان کی اس خصلت کو واضح کر رہے ہیں کہ وہ اپنی خوراک کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ کسی کا بھی حق چھین کر کھا سکتا ہے۔ اسے حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اپنا پیٹ بھرنا ہے۔

اُن کے ایک افسانے کا موضوع ''کیڑے مکوڑے'' ہے۔ اس افسانے میں دیہات کے ان پسے ہوئے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیلداروں، وڈیروں اور زمینداروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی زبانیں بند ہیں۔ اس افسانے میں دیہات کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ پولیس افسر ایک قتل کی تفتیش کرنے کے لیے جاتا ہے۔ مقتول ایک غریب کمہار ہے جو ذیلدار کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ اسے ذیلدار صرف زیادہ بولنے پر گولی مار دیتا ہے۔ اس قصے کا پورے

گاؤں کو علم ہوتا ہے مگر کسی کی اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ پولیس افسر مقتول کی بیوہ کی دی گئی درخواست کی وجہ سے تفتیش کے لیے آتا ہے۔ اپنی تفتیش کے دوران اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ذیلدار نے ہی اسے قتل کیا ہے لیکن ابھی اس کی نوکری نئی نئی ہے اور اپنے افسر کے حکم پر عمل کرتا ہے۔ اس لیے جب وہ بیان لیتا ہے تو اس میں یہ بات ہوتی ہے اور جب ڈاکٹری رپورٹ سامنے آتی ہے تو اس میں ''اس کو سانپ نے کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت ہوگئی''، لکھا ہوتا ہے۔ ذیلدار اس پولیس افسر کی خوب خاطر مدارت کرتا ہے اور قیام کے دوران پاؤں دبانے کے لیے اسی مقتول کی بیوہ کو بھیجتا ہے۔ جو ساری رات اس کا خیال رکھتی ہے۔ واپسی پر پولیس افسر کو آموں کی پیٹی بھی دی جاتی ہے۔ اس سارے منظر میں پولیس افسر کو جسم پر کیڑے مکوڑے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ پہلے اس کو باہر کی سطح پر محسوس ہوتے رہے پھر رات کے بعد اندر پھرتے محسوس ہو گئے۔ پولیس افسر کے ساتھ جو ڈرائیور گیا ہوتا ہے وہ کہتا ہے:

اصل میں صاحب جب آدمی باہر سے مرتا ہے تو اسے باہر سے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں اور جب اندر سے مرتا ہے تو اندر سے کھاتے ہیں۔(۱۵)

پولیس افسر اس کی بات سن کر سوچتا ہے کہ میں تو اسے نرا ان پڑھ سمجھتا تھا لیکن اس نے عجیب بات کی ہے۔ پولیس افسر قابل ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے جو کہ کہتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مرض نہیں ہے بس الرجی ہے۔ وہ اس بات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ احمد جاوید نے اپنے اکثر افسانوں میں جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کے موضوعات سے ثقافت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان ناسمجھ جانداروں کے ذریعے اشرف المخلوقات کو سمجھانے کے لیے ان گنت اشارے دیے ہیں۔ افسانے کے کرداروں کو قدم قدم پر تجربات کا سامنا ہوتا ہے جس سے ہر مرحلے کہانی کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ ذیلی نتائج بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

محمد حمید شاہد کے افسانوں میں مذہبی اور معاشرتی ثقافت کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے بے باکی کے ساتھ مسکراہٹوں اور میٹھے لفظوں سے معاشرے کی تلخیوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشرت اور مذہب کے ساتھ جذبات کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔ جذبات اور احساسات ثقافت کے باطنی پہلو میں شامل ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں معاشرتی اور مذہبی ثقافت کے پہلو عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے رہن سہن، پرورش اور ماحول کو ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے۔

محمد حمید شاہد اور احمد جاوید کے افسانوں میں مذہبی اور معاشرتی ثقافت کے وہ پہلو بیان کیے گئے ہیں جو دیہی اور شہری زندگی کے تمام مناظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ثقافت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ایک منفرد کوشش کی ہے۔

حواشی

(۱) غلام عباس، انٹرویو، روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۰ جولائی، ۱۹۷۸

(۲) سیّد وقار عظیم، فنِ افسانہ نگاری، (نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دسمبر ۱۹۷۷ء)، ص: ۳۷

(۳) عماد الحسن فاروقی، اسلامی تہذیب و تمدن، (لاہور: المصطفیٰ پبلشنگ سنٹر، ۱۹۹۶ء)، ص: ۱۱

(۴) فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، (کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۱۹۷۶ء)، ص: ۲۰

(۵) زوار طالب چوہدری، محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری کا جائزہ، (اسلام آباد: نمل یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء)، ص: ۴۷

(۶) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، پاکستان میں اُردو افسانہ (۱۹۴۷ء تا حال)، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ص ۹۱۶

(۷) محمد حمید شاہد، برف کا گھونسلہ، مشمولہ: بند آنکھوں سے پرے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص: ۴

(۸) زوار طالب چوہدری، محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری، ص: ۸۰

(۹) احمد جاوید، چڑیا گھر، (راولپنڈی: گندھارا بکس، ۱۹۹۶ء)، ص: ۱۷

(۱۰) محمد حمید شاہد، اللہ خیر کرے، مشمولہ: بند آنکھوں سے پرے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۳

(۱۱) زوار طالب چوہدری، محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری، ص: ۸۱

(۱۲) ایضاً، ص: ۸۳

(۱۳) احمد جاوید، چڑیا گھر، ص: ۳۷

(۱۴) احمد جاوید، گمشدہ شہر کی داستان، (لاہور: شوکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۲ء)، ص: ۳۸

(۱۵) احمد جاوید، کیڑے مکوڑے، مشمولہ چڑیا گھر، ص: ۱۱۲

مآخذ:

(۱) بیگ، حامد، ڈاکٹر مرزا، پاکستان میں اُردو افسانہ (۱۹۴۷ء تا حال)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۶ء

(۲) جاوید، احمد، چڑیا گھر، راولپنڈی: گندھارا بکس، ۱۹۹۶ء

(۳) ـــــ، گمشدہ شہر کی داستان، لاہور: شوکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۲ء

(۴) چودھری، زوار طالب، محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری کا جائزہ، اسلام آباد، نمل یونی ورسٹی، ۲۰۰۲ء

(۵) شاہد، محمد حمید، برف کا گھونسلہ، مشمولہ: بند آنکھوں سے پرے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

(۶) ـــــ، اللہ خیر کرے، مشمولہ: بند آنکھوں سے پرے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء،

(۷) عباس، غلام، انٹرویو، روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۰ جولائی، ۱۹۷۸

(۸) عظیم، وقار، سیّد، فنِ افسانہ نگاری، نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دسمبر ۱۹۷۷ء

(۹) فاروقی، عماد الحسن، اسلامی تہذیب و تمدن، لاہور: المصطفیٰ پبلشنگ سنٹر، ۱۹۹۶ء
(۱۰) فیض، فیض احمد، ہماری قومی ثقافت، کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۱۹۷۶ء

اخبار

(۱) روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۰ جولائی، ۱۹۷۸ء